

جذبہ

05-27-2017



فہرست

انٹرنیٹ

۱. سوشل میڈیا کے دانشور

معاشرہ اور ثقافت

۲. اپریل فول ، جھوٹ کا عالمی دن !

۴. اقبال اور فلسفہ خودی

۶. حکیم صاحب

۸. لاہور ایک قدیم شہر

۹. ماحولیاتی آلودگی کا شکار بچے

۱۰. ننھی پری

تو مجھے یو ہی نہیں رہا "

یہی صورتحال پانامہ لیکس کے حوالے سے بھی درپیش ہے ، طرح طرح کے تبصرے پڑھنے کے بعد بندہ خواہ مخواہ ہی خود کو جج سمجھ بیٹھتا ہے اور ان تبصروں کی روشنی میں فوراً فیصلہ صادر کر دیتا ہے کہ نواز شریف کو عہدہ سے ہٹانے کے علاوہ عمر بھر کیلئے نااہل قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض تبصرے تو بڑی ہی دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر عدالت عظمیٰ کی جیوری وہ پڑھ لے تو ان کی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی ، یقیناً کریں کہ قانون، آئین کی تشریحات جس قدر دلچسپ انداز میں فیس بک پر نظر آتی ہیں اس کا عشر عشر کوئی حقیقی ماہر قانون و آئین نہیں ہو سکتا۔

ایک تبصرہ نگار سے اچھی خاصی سلام دعا ہے، انکے ہر ادبی، سیاسی تبصرہ پر واہ واہ کریولوں کی تعداد ہمیشہ سینکڑوں میں ہوتی تھی، ایک دن ہم نے مشورہ دیا کہ ' آپ اچھا لکھتے ہیں آپ کی تحریروں، تبصروں میں جامعیت ہوتی ہے لہذا کسی قومی روزنامہ کا قصد کر لیں' انہوں نے بڑے ہی فخریہ انداز میں جواب دیا "انشا اللہ آپ آئندہ چند دنوں میں کسی بڑے قومی اخبار میں میری تحریر پڑھ سکیں گے" کچھ دن انتظار میں گزر گئے پھر پتہ چلا کہ ایک قومی اخبار انچارج ادبی صفحہ نے ان کے تبصرہ پر عجیب سا تبصرہ کیا " کچھ حصہ تو ڈاکٹریونس بٹ کی تخلیقات سے متاثرہ نظر آتا ہے، کچھ جملوں کی کانٹ چھانٹ فلاں فلاں رائٹر کے زیر اثر ہے، بعض پیروں پر فلاں فلاں ادبی لکھاری نے سپیل سے ہی قبضہ بھمایا ہوا ہے اور جملوں کی کاٹ حسن نثار سے مستعار لی گئی ہے" اس تبصرہ نگار کے تبصرہ پر اتنا بھرپور تبصرہ یقیناً بہت ہی دلچسپ تھا کہ اس کے بعد مزید کسی تبصرے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی

§§§

اس کے بعد یقیناً بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ ہمارا ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسی بحث مباحثہ کے چکر میں گزر گیا، گو کہ ابتدا میں یہ کام بڑا ہی دلچسپ تھا لیکن بعد میں یوریت ہونے لگی تو ہم نے فیس بک سے جان چھڑا مناسب سمجھی۔ خیر اگلے دن زید نے آن لائن ہوتے ہی پھر کہا کہ "واہ ثقلین بھائی مزہ آگیا آپ نے بکر کو خوب مزہ چکھلایا" ابھی ہم ان کے تفریقی جملوں کا لطف اٹھا رہے تھے کہ بکر صاحب نے آن لائن ہوتے ہی تقریباً ایسے ہی ملتے ملتے میسج کئے ، ہم نے دونوں کی تعریفیں دونوں باتوں سے سمجھیں اور گلے سے لگالیں۔

صاحبو! سوشل میڈیا پر محض یہ دو ہی ایسے کردار نہیں بلکہ روزانہ ایسے کردار سے واسطہ پڑتا ہے، جن کی فرمائشیں بھی عجیب ہوتی ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے لکھے پر واہ واہ کرنے کے علاوہ چند ایک جملے بھی لکھے جائیں تاکہ ان کی پوسٹ کی گئی "تخلیق نما شے" کی اہمیت و افادیت بڑھ جائے۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑیے یہ دیکھئے کہ واہ واہ کی خواہش کسے نہیں ہوتی لیکن سوشل میڈیا خاص طور پر فیس بک کے حوالے سے عجب طرز کی کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں اس دنیا کے دانشور جس قدر سچے اور سچے ہیں اسی قدر واہ واہ کریولوں کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔ پانامہ کیس سے لیکر پی ایس ایل تک ، اگر فیس بکی دانشوروں کے تبصرے پڑھے جائیں تو بندہ خود سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر اتنی ہی دانش ان افراد میں ہوتی تو قوم کی یہ حالت نہ ہوتی۔ گویا دانش بیچاری بھی دانشوروں کی عقل پر ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ 2013 کے انتخابات کے دوران بھی عالم کچھ ایسا ہی تھا ، طرح طرح کے تبصروں سے ہم نے نتیجہ اخذ کیا کہ اب کی بار نہ تو پیپلز پارٹی جیت پائے گی اور نہ ہی مسلم لیگ کے سر کامیابی کا سہرا سچے گا ، عمران خان بھی بس ففٹی ففٹی کامیابی حاصل کریں گے ؟ لیکن اصل کامیابی ہوگی کس کی؟ یہ سوال الیکشن کے نتائج تک احوار ہی رہا لیکن جو نئی انتخابات ہوئے تو پتہ چلا کہ مسلم لیگ ن واضح اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ سوال وہی کہ اگر فیس بک کے دانشوروں کے اٹھائے گئے چاند سورج کے بارے قیاس کیا جائے تو یہی لگتا ہے کہ ابھی دن کو رات اور رات کو دن بدلیں گے۔

ایک ایسے ہی فیس بکی دانشور سے بات چیت ہو رہی تھی فرمانے لگے " پی ایس ایل کی ٹیموں کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کراچی کنکر ، لاہور قلندر جیسی ٹیموں پر خود انہیں بھی اعتبار نہیں، پشاور زلمی ، کونڈ گلیڈی ایٹر کے جیتنے کے بھی امکانات کم ہیں، اسلام آباد یونائیٹڈ بھی گزشتہ برس جیسی مضبوط ٹیم نہیں ہے" اس تبصرہ نگار سے ہم نے پوچھا " پھر کون جیتے گا " یہ سوال پڑھتے ہی انہوں نے فرمایا "اوہ ہ ہو د و، یہ

سوشل میڈیا کے دانشور

مصنف: حاجی بصیر سراج

زید سے ہماری سلام دعا یا گپ شپ فیس بک کے ذریعے ہوئی، گپ شپ بھی بذریعہ میسج ہوتی رہی ، دوران گپ شپ پتہ چلا کہ یہ صاحب کسی مذہبی جماعت کے کارکن اور ایک بہت بڑے مذہبی رہنما کے سامنے والے ہیں ایک دن انہوں نے ہمیں فیس بک کے ان باکس میں میسج کیا کہ "ثقلین بھائی! میری وال پر فلاں صاحب نے میرے قلم کے بارے میں عجیب و غریب جملے لکھ رکھے ہیں، پلیز آپ اسے جواب دیں" ان کی بات نے حیران کر دیا ، ہم نے عرض کی "حضور! دیکھیں ہو سکتا ہے کہ آپ کے قلم کے حوالے سے ہمارے بھی تحفظات ہوں اس لئے آپ براہ کرم ہمیں معاف رکھیں،" زید نے کہا کہ " آپ ایسا کریں میری وال پر آپ ایک دفعہ دیکھ لیں کہ اس نے کیا بکواس کر رکھی ہے، اس کے بعد آپ مجھے اس کا جواب لکھ کر ان باکس کریں" تجویز خاصی معقول تھی اس لئے ہم نے حامی بھری ، اتفاق دیکھئے کہ ان کی وال پر عجیب و غریب تبصرے کریوٹالے صاحب (انہیں آپ بکر سمجھ لیں) بھی ہمارے فیس بکی دوست تھے، بکر کے تبصرہ کو غور سے پڑھا اور پھر اس کا اردو فائنٹ میں جواب لکھ کر زید کو ان باکس کر دیا، دو تین مرتبہ یہ کام کرنے کے بعد اچانک بکر کی طرف سے ان باکس میں میسج ملا "ثقلین بھائی! یہ لڑکا زید جو ہے ، اس کی وال پر میری بحث چل رہی ہے اچانک اس نے اتنے دلائل کے ساتھ جواب دینا شروع کر دیا کہ میں حیران ہوں، آپ پلیز میری حملیت میں لکھ دیں کیونکہ آپ نے بھی ایک سے زائد مرتبہ اس کے قلم کے حوالے سے کچھ ایسی ویسی باتیں لکھی تھیں" ہم نے عرض کی "حضور! وہ باتیں اس وقت کے حساب سے تھی ہمارا ان کے قلم سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں اس لئے آپ ہمیں معاف رکھیں" بکر نے منت کے انداز میں کہا کہ "اچھا ایسا کریں آپ جواب لکھ کر مجھے ان باکس کریں میں خود پوسٹ کر دوں گا "



اپریل فول ، جھوٹ کا عالمی دن !

مصنف: اسد احمد

یکم اپریل کو جھوٹ کا دن منانے کے بارے میں مختلف قسم کے واقعات ملتے ہیں، جس سے علم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اپریل لاطینی زبان کے لفظ اپریلس یا اپرائز سے ماخوذ ہے۔ مطلب ہے پھولوں کا کھلنا، قدیم رومی قوم موسم بہار کی آمد پر شراب کے دیوتا کی یا دیوی کی پرستش کرتی اور اسے خوش کرنے کے لئے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے، ترنگ میں آتے اور جھوٹ بولتے۔ آگے چل کر یہ دن اپریل فول کہلایا۔ اپریل فول 1508ء سے 1539ء تک صرف یورپ میں منایا جاتا تھا اور اٹھارویں صدی میں برطانیہ میں منانے لگے اور اب چند سالوں سے پوری دنیا میں جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔



اپریل فول کا تذکرہ سب سے پہلے ایک انگریزی اخبار ڈریک نیوز لیٹر سے ملتا ہے یکم اپریل 1846ء کو اپریل فول کے موقع پر یورپ میں جو واقعات رونما ہوئے ان میں سے ایک اہم اور مشہور واقعہ یہ ہے کہ 31 مارچ کو ایک انگریزی اخبار میں یہ خبر آئی کہ کل شہر کے زراعتی فارم پر گدھوں کی عام نمائش ہوگی اور میلہ ہوگا تو لوگ خوش و خرم وہاں جمع ہوئے اور نمائش کا انتظار کرنے لگے۔ جب لوگ انتظار کر کر کے تھک گئے تو پوچھنے پر بتایا گیا کہ جو لوگ نمائش دیکھنے آئے ہیں وہی گدھے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کو ہر سال 2 اپریل کی اخبارات میں دیکھا جاسکتا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس دن جھوٹ بول کر کیسے لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ اگر اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اپریل فول منانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات میں جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے، جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہے، یہ منافقت کی نشانی ہے، اور

اپریل فول میں تو ایک تو جھوٹ بولا جاتا ہے اوپر سے اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے۔ اس کی خوشی منائی جاتی ہے۔ اس رسم اپریل فول میں جھوٹ بولا جاتا ہے دوسروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، دھوکہ دیا جاتا ہے، غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کی جاتی ہے، تکبر کیا جاتا ہے۔ جھوٹ بول کر دوسروں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سچ بولنا نیکی ہے اور نیکی جنت لے جاتی ہے اور جھوٹ بولنا گناہ ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔ تیسری حدیث میں ہے کہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر حرام ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کے شراغیز ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی مسلمان بھائی کو حقیر جان لے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں ڈھاتا وہ اسے رسوا نہیں کرتا اور نہ وہ اسے حقیر جانتا ہے۔ اور یہ سب برائیاں ایک اپریل فول منانے میں موجود ہیں۔

اس دن کو منانے سے دشمنان اسلام کی خوشیوں میں شرکت کا گمان ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر انسان گناہ کبیرہ یعنی جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اب رہ گئی پاکستان معاشرے کی بات کہ اس میں اس جھوٹ کے عالمی دن کو کیوں منایا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مختصر یہ کہ خوشی کے لیے، حالانکہ جھوٹ بول کر خوشی منانے کا کیا جواز ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں جھوٹ بول کر ہی خوشی منائی جاتی ہے، روزی روٹی کمائی جاتی ہے، کاروبار کیے جاتے ہیں سیاست و صحافت چمکانی جاتی ہے۔ دوسروں کو بے وقوف بنا کر ہم لذت حاصل کرتے ہیں، خوشی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بھی کہنا ہے کہ جھوٹ بولنا اب ہمارے معاشرے میں گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ صادق ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ مسلمان گناہ گار ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہمارے سیاست دان روز بہ روز جھوٹ بولتے ہیں یعنی روز ہمارے ساتھ اپریل فول مناتے ہیں۔



اسی طرح ہمارے صحافی بھائی، اینکر پرسن، کالم نویس، بھی ہر روز ہم عوام کے ساتھ اپریل فول مناتے ہیں، اس کو چھوڑیں عوام بھی جہاں جہاں بس چلتا ہے ایک دوسرے سے ہر روز اپریل فول مناتی ہے، عام آدمی بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ اب مجھے یاد نہیں ہے لیکن کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ پاکستان میں سب سے زیادہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔



جس نے یہ روپورٹ لکھی تھی اسے شاید علم نہیں تھا کہ پاکستانی جھوٹ بول کر خوش بھی ہوتے ہیں اس لیے پاکستانیوں کے لیے تو ہر دن ہی اپریل فول ہے۔ دو نمبر مال دے کر، زیادہ پیسے لے کر، ملاوٹ والی چیزیں بیچ کر، جھوٹے مقدمات بنا کر، ایک دوسرے سے ہر روز اپریل فول ہی مناتے ہیں۔

اس لیے یہ دن ان کو منانا چاہیے جہاں جھوٹ نہیں بولا جاتا چلو ایک دن جھوٹ بول کر دل پشوری کر لیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جن کی نقل میں ہم اپریل فول مناتے ہیں وہ کم جھوٹ بولتے ہیں۔ پاکستان میں تو اس دن کو منانا اس دن کی تو بین ہے۔ کیونکہ یہاں تو ہر روز منایا جاتا ہے، سب سے منایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب خصوصاً اہل یورپ افراط معاشرہ کے ساتھ عملی مذاق اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کی غرض سے ایک مخصوص دن میں یہ تہوار مناتے ہیں۔ جھوٹ کے دن پورا بیچ! یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر روز یہ دن منایا جاتا ہے۔

ہم بات کر رہے تھے کہ پاکستانی معاشرے کی کہ اس میں اس جھوٹ کے عالمی دن کو کیوں منایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اوپر لکھی ہے عارضی خوشی حاصل کرنے کے لیے اس کے علاوہ دوسروں کو حقیر جانا بھی اس کی ایک وجہ ہے۔ اپریل فول میں ایسے کام کیے جاتے ہیں جن میں انہیں حقیر جانا گیا ہے بلکہ انہیں حقیر سمجھنا ہی ان سے مذاق کرنے پر ابھارتا ہے لوگوں کو احق قرار دینا۔ ہم خود دوسروں سے اعلیٰ خیال کرتے ہیں۔

اس خامی سے کم ہی بچے ہوں گے ہمارے سیاست دان، صحافت، اور عام آدمی بھی دوسروں کو گھٹیا ہی خیال کرتا ہے جیسے جھوٹ نے ہمارے معاشروں کو برباد کر دیا ہے ایسے ہی تکبر ہے اور اس رسم اپریل فول میں یہ دونوں برائیاں پائی جاتی ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ اپریل فول منانے کی وہاء دیگر بہت سی وہاؤں کی طرح پھیلتی جا رہی ہے ہمارے نوجوانوں کی اکثریت اسے بغیر سوچے سمجھے قبول کر رہی ہے، اس کی ایک وجہ مغرب کی پیروی بھی ہے کیونکہ ہمارے نوجوانوں کی اکثریت

مغرب سے متاثر ہے، ہمارے نوجوان خود کو جدت پسند کہلانے کے لیے بھی یہ دن منا رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے نوجوان سچین میں مسلمانوں کے قتل عام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام والے واقعہ کی یاد میں یہ دن نہیں مناتی۔

ہمارے ذرائع ابلاغ سے اگر مناسب طریقے سے عوام کے لیے آگاہی مہم چلائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان سے اس رسم بد کا خاتمہ نہ کیا جاسکے آخر میں قرآن پاک کی سورۃ الحجرات کی ایک آیت کا مفہوم۔ اے ایمان والوں کوئی قوم کسی کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ (جن کا مذاق اڑایا جاتا ہے) ان سے بہتر ہوں، نہ عورتیں ہی دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ، نہ کسی کو برے لقب دو اسلام لانے کے بعد فسق بہت ہی برا نام ہے جس نے توبہ نہ کی وہی ظالم لوگ ہیں۔

§§§

اقبال اور فلسفہ خودی

مصنف: اسد احمد



میسویں صدی میں اسلامی فکر کے احیاء و تجدید میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا نام ایک روشن ترین مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر کی ادبی تاریخ میں بہت کم ایسی شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کی طرح ذہنوں پر اتنے گہرے اثرات مرتب کئے ہوں اور سیاسی و سماجی دھارے کا رخ موڑ دیا ہو۔ انکا خطبہ الہ آباد ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کی اساس بنا۔ علامہ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ ”خودی کی تلوار“ سے مسلمانان ہند کا ایک الگ آزاد اسلامی ملک وجود میں آنے والا ہے۔ اقبال کا ہی احسان ہے اور کارنامہ بھی کہ قائد اعظم کو اس جدو جہد کا رہبر بننے پر راضی کیا۔ علامہ انیس سو اڑتیس میں فوت ہوئے لیکن انکے افکار سے پاکستان، انڈیا، ایران، ترکی، افغانستان اور مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب بھی استغناء کر رہا ہے۔ اقبال نے بالکل ٹھیک کہا تھا: کہ

ع اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو

لاہور سے تا بہ خاک بخارا و سر قند

علامہ اقبال کی شاعری کا بنیادی مرکز ”فلسفہ خودی“ ہے۔ انھوں نے خودی کے فلسفے کو اس قدر شاندار اور بے مثال انداز میں پیش کیا ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے اور پھر عمل کرنے سے نہ صرف فرد بلکہ اقوام بھی اپنی زندگیوں میں انقلابی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اور وہ شیطان کی بیرونی کی بجائے ایک اللہ کی بندگی کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔

اب ہم اس پر تفصیل کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

انسان کا وجود: انسان کا وجود دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک اسکا بدن ہے، اسکا ”خاکی وجود“ ہے اور دوسری

چیز اسکی ”روح“ ہے۔

در حقیقت نسان ”خاکی وجود“ کے تقاضے پورے کرنے میں دن رات مصروف ہے۔ وہ اس عمل میں اتنا لگن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا ”مصل وجود“ اپنی ”روح“ کو بھول جاتا ہے۔ وہ کھانے، پینے، معاشی سرگرمی، خاندان کے ضروریات پورے کرنے اور دیگر انسانی معاملات میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ وہ مادہ پرست، دنیا پرست اور آخر کار شیطان کا کارکن بن جاتا ہے۔ وہ روح کے تقاضے پورے کرنا بھول جاتا ہے۔ وہ دنیا کی بھول بھلیوں میں اپنے خالق، اپنے رب کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ دن رات مادی وجود کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ یہ ”نفس لہارہ“ کی کیفیت ہے اور بہت بڑی تباہی ہے۔

انسانی روح کیا ہے؟

انسان کی اصل حقیقت اسکی پاکیزہ روح ہے۔ انسانی روح کی وجہ سے اسے مسجود ملائک کا درجہ ملا ہے۔ روح کا تعلق مذہب اور رحمانیت سے ہے۔ یہی روح اسے دیگر حیوانوں سے الگ کرتی ہے۔ جسم کے مرنے سے روح نہیں مرتی۔ وہ واپس اپنے خالق کی پاس چلی جاتی ہے۔ اور تب انسان دنیاوی زندگی کا جواب دہ ہوتا ہے۔ محض جسم کے تقاضے پورے کرنے سے ”روح“ کو چین نہیں مل سکتا۔

اقبال کا فلسفہ خودی ڈارون کی زہریلی تھیوری آف بیومن ایولوشن کا تریق ہے:

ڈارون نے کہا تھا کہ انسان حیوان کی ترقیاتی شکل ہے۔ حیوان اور انسان ایک ہی چیز ہے۔ بس انسان نے ذرا ترقی کی اور موجودہ تہذیب تک پہنچا۔ اسکے مطابق انسان محض حیوانی جبلتوں کا حامل ہے۔ مان، بہن، بیٹی اور بیوی میں کوئی فرق نہیں۔ حیوان کی طرح انسان جس سے چاہے اور جب چاہے، جنسی اختلاط کر سکتا ہے۔ حیوانوں کی طرح انسانوں کا بھی کوئی مذہب نہیں ہونا چاہئے۔ گویا ”جانور“ انسان کا باوہ آدم ہے۔ چنانچہ ”ڈارون“ کے اس تباہ کن نظریے نے مذہب، ادب، اخلاقیات، شرف انسانیت کا جنازہ نکال دیا ہے۔

اقبال کا ”فلسفہ خودی“ ڈارون کے اس تھیوری کا توڑ ہے۔ اور اسکے زہریلے اثرات کا تریق بھی ہے۔ اقبال کی خودی کا فلسفہ انسان کو جانور سے بلند تر مخلوق بتاتا ہے۔ یہ ہمیں حیوانی طرز حیات سے بلند کر کے رحمانیت کا راستہ دکھاتا۔ انسان کے خاکی وجود سے مبرا وہ بھی اسکی ایک عظیم ہستی ہے، جسے فنا نہیں۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کی خوشنودی ہے۔

تو راز کن دکھاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا

خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترہاں ہو جا

خودی کی معنی: خودی کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ خودی محمود ہے، مقبول ہے، قابل قبول ہے، قابل ستائش ہے، اچھی چیز ہے۔ یہ ہر باطل سے استغناء اور بے نیاز ہے۔ اس میں

انسان اپنے اندر کی روشنی کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنی اصلیت کی تلاش کرتا ہے۔ وہ نفس مطمئنہ سے بھی آگے کے سفر پر ریاقت کرتا ہے اور وہ اپنے روحانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور یوں اپنے مالک، اپنے رب تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ خودی انسان کی انا ہے، عزت ہے، غیرت ہے، اسکی اندر کی ”میں“ ہے، اسکی روح ہے۔ اور یہی اسکی اصل پہچان ہے۔ خاکی وجود کے علاوہ جو اسکی روح ہے اسکی پہچان اور عرفان انسان کا اصل مقصد حیات ہے۔ اسی عرفان کی وجہ سے بندہ اپنے رب کی رضا کے لئے دن رات لگ جاتا ہے۔ حیوانی خواہشوں کی پوجا کی بجائے انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

اسکا ایک دوسرا مطلب بھی ہے: کہ انسان جب نفس لہارہ کا پچھا ری بن جاتا ہے تو ایسے بندے کی خودی اسے حیوان کے برابر کر دیتی ہے۔ اس حالت میں انسان اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اندر کی روشنی کو بھول کر اپنی دنیا پرستی اور ہوس پرستی کی وجہ سے خاکی وجود کی پرستش کرتا ہے۔ تب یہ خودی بری چیز ہے، قابل مذمت ہے اور خودی کی یہ کیفیت بہت مذموم ہے۔

اقبال خودی کو ان دو نون مطالب میں استعمال کرتا ہے۔ وہ نفس لہارہ والی خودی کو ترک کرنے اور نفس مطمئنہ والی خودی کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ ”طلوع سر“ میں اقبال کہتا ہے:

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے

نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاوایں ہو جا

فلسفہ خودی کی اساس: علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کا ماخذ قرآن حکیم کی ”سورۃ حشر آیت نمبر آٹھارہ“ ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم متعدد مرتبہ اپنے لیکچرز میں اس حقیقت کی گواہی دے چکے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان اپنے پیدا کرنے والے اور تخلیق کرنے والے رب کو بھلا دیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے انسان کو اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا تاکہ وہ اپنے من میں ڈوب کر اپنے رب کو تلاش کرے۔ وہ دیکھے کہ اسکی اصل حقیقت کیا ہے، ملائکہ سے اسکو سیدہ کروایا گیا ہے۔ وہ ایک بلند مخلوق ہے۔ وہ حیوان نہیں ہے بلکہ اللہ نے اسے اشرف المخلوقات بنا یا ہے۔ لہذا وہ اپنی پاکیزہ روح کو پہچانے۔ اپنے اندر جھانکے تو اسے معلوم ہوگا کہ اسکی زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے۔ اس مقصد کے حصول میں اپنی زندگی گزارے۔ لیکن اگر انسان ایسا کرنے کی بجائے اپنے خالق کو بھول بھال کر نفس لہارہ کا غلام بن جائے، شیطان کا پجاری ری بن جائے اور دن رات اپنے خاکی وجود کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جائے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے انسان کو اپنی رحمت اور ہدایت سے دور کر دیتا ہے، وہ مردود ہو جاتا ہے۔ جو انسان اپنے رب کا ناشکرہ بن جاتا ہے، اللہ سے بے خوف ہو جاتا ہے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو بھی بھول جاتا ہے۔ پھر وہ نفس آمارہ اور نفس آوارہ

کہ اپنے بندے کی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔ جب انسان مقتدر بن جائے۔ اس مقام پر انسان اپنے تقدیر خود لکھوانے لگتا ہے۔ اللہ اسکی ہر مراد پوری کرتا ہے۔ ہر سفارش قبول کرتا ہے۔ اللہ رعالی اپنی خلائق اسکے تابع کر دیتا ہے۔ خودی کے اس آخری درجے پر بندہ اپنے خالق کی اس قدردانی کا حقدار بن جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس مقام کی صحیح عکاسی کے لئے ہی وہ مشہور شعر کہا ہے:

خود کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکی زور بازو کا

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرت علامہ اقبال کا ”فلسفہ خودی“ انکی شاعری کا نچوڑ ہے۔ یہ وہی فلسفہ ہے جسے برصغیر کے کمزور اور غلام مسلمانوں نے اپنا کر اپنے لئے ایک الگ آزاد وطن پاکستان حاصل کیا۔ اس فلسفے پر عمل پیرا ہو کر ہم آج بھی اپنی دنیاوی زندگی کا رخ موڑ سکتے ہیں تاکہ فانی انسان جو کہ اپنی اصلیت، اپنی روح کی تقاضوں کو بھول چکا ہے وہ ایک اللہ کی مرضی کے مطابق اپنی روح کی پرورش شروع کر سکے۔

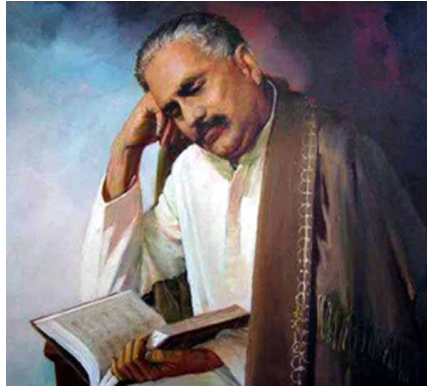
قرآن مجید کی سورۃ حشر میں اللہ نے جس نوع کے انسانوں کو نا پسند فرمایا ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم ایسے انسانوں کا راستہ چھوڑ دیں جنہوں نے رب کو ٹھکرا دیا ہے۔ وہ خسارے اور مکمل تباہی کا راستہ ہے۔ اقبال ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ فانی وجود کو اتنا وقت دو جتنا انسانی بدن نے اس دنیا میں رہنا ہے اور اپنی ”روح“ کی پاکیزگی کو اتنا وقت دیں جتنا اس نے وہاں اُس جہاں میں اپنے خالق کے پاس رہنا ہے۔

اقبال کا ”فلسفہ خودی“ اپنانے میں انسانیت کی فلاح ہے۔ اس میں شیطان کی غلامی سے نجات ہے۔ سچ یہ ہے کہ مادہ پرستی اور نفس آمادہ کا راستہ چھوڑ کر اقبال کے فلسفہ خودی کو اپنا کر اور سورۃ حشر کے مطابق ہم اپنے رب کی رضا کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔

’اسرارِ خودی‘ میں اقبال کہتا ہے:

اے مسلمان! تُو خودی کو نہ چھوڑ اور خود کو اس طرح بنالے، جسکا انجام بقاء پر ہو۔

تیری چمک دمک خودی کی نور سے ہے۔ اگر تُو اپنی خودی کو مضبوط کر لے، تُو تجھے دوام حاصل ہو جائے۔



نفس لوامہ: انسان جب مادہ پرستی ترک کرتا ہے اور رب کی رضا کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ اپنے رب کی رضا کے لئے عبادات اور ریاضت شروع کرتا ہے۔ یہ کامیابی کا راستہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب ایک مسلمان کو اپنی اصلیت کا احساس ہو جاتا ہے کہ اللہ نے اسے خاکی وجود کے ساتھ ساتھ اسکے اندر ایک نفیس روح بھی عطا فرمائی ہے۔ اس روح کی پہچان اور اسکے تقاضے پورے کرنا لازم ہے۔ رب نے اسے اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور یہ کہ مادہ پرستی اور خدا کی مرضی کے خلاف دنیا پرستی خسارے کا سودا ہے۔

نفس مطمئنہ: خودی اور خود آگاہی کے راستے پر سفر کرتے کرتے انسان اس مقام پر آجاتا ہے جب رب کی طرف سے نیک اور پاکیزہ خیالات آنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ملتی ہے۔

نفس مطمئنہ: اس مقام پر انسان خدا کا مخاطب ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کے قریب اور شیطان سے کافی دور چلا جاتا ہے۔ انسان کو اطمینان قلب نصیب ہو جاتا ہے۔ دنیاوی آسائشیں اور دلکشیوں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے رب کی رضا پر خوش رہتا ہے۔ کوئی شکوہ شکایت نہیں رہتی۔

نفس راضیہ: بندگی اور خودی کا سفر جب مزید آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان سے راضی ہو جاتا ہے۔ بندہ اپنی بندگی کے اس مقام پر اپنے رب کو راضی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان اپنی عبادات اور ریاضتوں سے اپنے محبوب رب کو خوش کر دیتا ہے۔ تب اللہ اپنے بندے فرماتا ہے کہ تو میرا سچا بندہ ہے۔ میں تیری بندگی سے راضی ہوں۔ اقبال کہتا ہے:

ع ہر لحظہ ہوں مومن کی نئی شان نئی آن

گفتار میں کردار میں اللہ کی زبان

نہ تاج و تخت میں ہے نہ لشکر و سپاہ میں ہے

جو بات مردِ قلندر کی نگاہ میں ہے

نفس مرضیہ: خودی اور کامل بندگی کی بلندی کا یہ آخری مقام ہے خدا تعالیٰ سب سے بڑا قدردان ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب اللہ پاک اپنے بندے سے اتنا خوش ہو جائے

میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ عظیم خسارہ ہے۔ یہ سب سے بڑی تباہی ہے۔ اقبال مسلمانوں کو کہتا ہے کہ:

ع بے خبر تو جو ہر آئینہ ایم ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے۔

وہ کہتا ہے کہ مسلمان اپنے آپکو، اپنے تن من کو نفس امارہ کی پیروی کرنے میں فقط چند دنیاوی اشیاء کے حصول میں نہ کھپائے۔ اگر وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے تو پھر اللہ تو بے نیاز ہے۔ پھر خسارے میں تو انسان ہی رہے گا۔

لہذا اقبال نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو اس خسارہ عظیم اور نفسانی آوارگی سے واپس روحانی زندگی میں لانے کا واحد نسخہ ”کیما“ ”فلسفہ خودی“ میں ہے۔ جب فلسفہ خودی سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کا سفر اختیار کر لیں گے تو دین و دنیا دونوں میں فلاح پالیں گے۔ انکے خیال میں مسلمانوں کی پس ماندگی، غلامی، جہالت اور دنیا پرستی کا علاج ”فلسفہ خودی“ میں پنہاں ہے۔

اقبال کہتا ہے:

ع دیر عشق میں اپنا مقام پیدا کر

نیا زمانہ نئی صبح و شام پیدا کر

میرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے

خودی نہ بچ غریبی میں نام پیدا کر

خودی کے خواص:

اقبال کے شاہین کے جو صفات ہیں، وہی فلسفہ خودی کے خواص ہیں

بلند پرواز، تیز نگاہ، کسی اور کا مارا ہوا شکار نہ کھانا، خلوت پسندی۔ جب انسان نفیس ترین خودی کی منزل کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے تو وہ ان صفات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ فقر و عشق سے بھی معمور ہوتا ہے۔ تب وہ اپنی منزل کے اختتام پر مرد مومن اور مرد حق بن جاتا ہے۔ تب وہ خودی کے دیگر مدارج بھی طے کر کے اللہ کا صحیح کارکن اور قبول بندہ بن جاتا ہے۔

خودی کے بیٹھے پھل کا درخت آتا ہے۔

عشق کے بغیر کوئی انسان نفس امارہ سے بلند ہو کر نفس راضیہ کے مدارج طے نہیں کر سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ انسان نفس امارہ کے دلدل سے خاکی وجود کو نکال کر دخو دی محمود کی طرف کا روح پرور سفر، عشق کے بغیر نہیں کر سکتا۔

خودی کے مدارج:

نفس امارہ۔ نفس لوامہ۔ نفس مطمئنہ۔ نفس مرضیہ۔ نفس راضیہ۔

نفس امارہ: اسکا مطلب ہے، دنیا پرستی، مادہ پرستی اور شیطان پرستی۔ تکبر، غرور اور انکار حتیٰ کہ انسان کفر کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

حکیم صاحب

مصنف: اسد احمد

دوائیاں دکھائیں اور ساری بات بتائی تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا وہ انسان نہیں کوئی فرشتہ ہے اور اس کی دی ہوئی ادویات ہمارے من کی مراد پوری کرنے کا باعث بنیں گی۔ حکیم صاحب آج میرے گھر میں تین پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

ہم میاں بیوی ہر وقت آپ کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی پاکستان چھٹی آئی۔ کار اوھر روکی لیکن دکان کو بند پایا۔ میں کل دوپہر بھی آیا تھا آپ کا مطب بند تھا۔ ایک آدمی پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر آپ کو حکیم صاحب سے ملنا ہے تو آپ صبح ۹ بجے لازماً پہنچ جائیں ورنہ اُن کے ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ اس لیے آج میں سویرے سویرے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔

محمد علی نے کہا کہ جب ۱۵ سال قبل میں نے یہاں آپ کے مطب میں آپ کی چھوٹی سی بیٹی دیکھی تھی تو میں نے بتایا تھا کہ اس کو دیکھ کر مجھے اپنی بھانجی یاد آ رہی ہے۔

حکیم صاحب ہمارا سارا خاندان انگلینڈ سیٹل ہو چکا ہے۔ صرف ہماری ایک بیوہ بہن اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے۔ ہماری بھانجی کی شادی اس ماہ کی ۲۱ تاریخ کو ہونا تھی۔ اس بھانجی کی شادی کا سارا خرچ میں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ ۱۰ دن قبل اسی کار میں اسے میں نے لاہور اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجا کہ شادی کے لیے اپنی مرضی کی جو چیز چاہے خرید لے۔ اسے لاہور جاتے ہی بخار ہو گیا لیکن اس نے کسی کو نہ بتایا۔ بخار کی گولیاں ڈسپینر وغیرہ کھاتی اور بازاروں میں پھرتی رہی۔ بازار میں پھرتے پھرتے اچانک بے ہوش ہو کر گری۔ وہاں سے اسے ہسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کو ۱۰۶ ڈگری بخار ہے اور یہ گردن توڑ بخار ہے۔ وہ بے ہوشی کے عالم ہی میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔

اُس کے فوت ہوتے ہی نجانے کیوں مجھے اور میری بیوی کو آپ کی بیٹی کا خیال آیا۔ ہم میاں بیوی نے اور ہماری تمام فیملی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی بھانجی کا تمام جہیز کا سامان آپ کے ہاں پہنچا دیں گے۔ شادی جلد ہو تو اس کا بندوبست خود کریں گے اور اگر ابھی کچھ دیر ہے تو تمام اخراجات کے لیے رقم آپ کو نقد پہنچا دیں گے۔ آپ نے ناں نہیں کرنی۔ آپ اپنا گھر دکھا دیں تاکہ سامان کا ٹرک وہاں پہنچایا جا سکے۔

حکیم صاحب حیران و پریشان یوں گویا ہوئے ”محمد علی صاحب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مجھے سمجھ نہیں آ رہا، میرا اتنا دماغ نہیں ہے۔ میں نے تو آج صبح جب بیوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹ یہاں آ کر کھول کر دیکھی تو مرجح سالہ کے بعد جب میں نے یہ الفاظ پڑھے ”بیٹی کے جہیز کا سامان“ تو آپ کو معلوم ہے میں نے کیا لکھا۔ آپ خود یہ چٹ ذرا دیکھیں۔ محمد علی صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ”بیٹی کے جہیز“ کے سامنے لکھا ہوا تھا ”یہ کام اللہ کا ہے، اللہ جانے۔“

پر رحم آگیا تھا اور وہ میرا گھر آباد کرنا چاہتا تھا۔ ہوا اس طرح تھا کہ میں لاہور سے میرپور اپنی کار میں اپنے آبائی گھر جا رہا تھا۔ عین آپ کی دکان کے سامنے ہماری کار پکچر ہو گئی۔

ڈرائیور کار کا پیہہ اتار کر پنچر لگوانے چلا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ میں گرمی میں کار کے پاس کھڑا ہوں۔ آپ میرے پاس آئے اور آپ نے مطب کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اوھر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی بھی یہاں آپ کی میز کے پاس کھڑی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی ”دپٹیں ناں، مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ اُسے کہہ رہے تھے بیٹی تھوڑا صبر کرو ابھی چلتے ہیں۔“

میں نے یہ سوچ کر کہ اتنی دیر سے آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔ مجھے کوئی دوائی آپ سے خریدنی چاہیے تاکہ آپ میرے منٹھے کو زیادہ محسوس نہ کریں۔ میں نے کہا حکیم صاحب میں ۵۰۶ سال سے انگلینڈ میں ہوتا ہوں۔ انگلینڈ جانے سے قبل میری شادی ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اولاد کی نعت سے محروم ہوں۔ یہاں بھی بہت علاج کیا اور وہاں انگلینڈ میں بھی لیکن ابھی قسمت میں مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔

آپ نے کہا میرے بھائی! توبہ استغفار پڑھو۔ خدا را اپنے خدا سے مایوس نہ ہو۔ یاد رکھو! اُس کے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں۔ اولاد، مال و اسباب اور غنی خوشی، زندگی موت ہر چیز اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی حکیم یا ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی دوا میں شفا ہوتی ہے۔ شفا اگر ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ اولاد دینی ہے تو اسی نے دینی ہے۔

مجھے یاد ہے آپ باتیں کرتے جا رہے اور ساتھ ساتھ پڑیاں بنا رہے تھے۔ تمام دوائیاں آپ نے ۲ حصوں میں تقسیم کر کے ۲ لفافوں میں ڈالیں۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ میرا نام محمد علی ہے۔ آپ نے ایک لفافہ پر محمد علی اور دوسرے پر بیگم محمد علی لکھا۔ پھر دونوں لفافے ایک بڑے لفافہ میں ڈال کر دوائی استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ میں نے بے دلی سے دوائی لے لی کیونکہ میں تو صرف کچھ رقم آپ کو دینا چاہتا تھا۔ لیکن جب دوائی لینے کے بعد میں نے پوچھا کتنے پیسے؟ آپ نے کہا بس ٹھیک ہے۔ میں نے زیادہ زور ڈالا، تو آپ نے کہا کہ آج کا کھانا بند ہو گیا ہے۔

میں نے کہا مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔ اسی دوران وہاں ایک اور آدمی آچکا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کھانا بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے گھریلو اخراجات کے لیے جتنی رقم حکیم صاحب نے اللہ سے مانگی تھی وہ اللہ نے دے دی ہے۔ مزید رقم وہ نہیں لے سکتے۔ میں کچھ حیران ہوا اور کچھ دل میں شرمندہ ہوا کہ میرے کتنے گھٹیا خیالات تھے اور یہ سلاہ سا حکیم کتنا عظیم انسان ہے۔ میں نے جب گھر جا کر بیوی کو

پنجاب کے شہر گجراتولا میں ایک حکیم صاحب ہوا کرتے تھے، جن کا مطب ایک پرانی سی عمارت میں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب روزانہ صبح مطب جانے سے قبل بیوی کو کہتے کہ جو کچھ آج کے دن کے لیے تم کو درکار ہے ایک چٹ پر لکھ کر دے دو۔ بیوی لکھ کر دے دیتی۔ آپ دکان پر آ کر سب سے پہلے وہ چٹ کھولتے۔ بیوی نے جو چیزیں لکھی ہوتیں۔ اُن کے سامنے اُن چیزوں کی قیمت درج کرتے، پھر اُن کا ٹوٹل کرتے۔ پھر اللہ سے دعا کرتے کہ یا اللہ! میں صرف تیرے ہی حکم کی تعمیل میں تیری عبادت چھوڑ کر یہاں دنیا داری کے پیکروں میں آ بیٹھا ہوں۔ جو ہی تو میری آج کی مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دے گا۔ میں اسی وقت یہاں سے اُٹھ جائوں گا اور پھر یہی ہوتا۔ کبھی صبح کے ساڑھے نو، کبھی دس بجے حکیم صاحب مریضوں سے فارغ ہو کر واپس اپنے گاؤں چلے جاتے۔

ایک دن حکیم صاحب نے دکان کھولی۔ رقم کا حساب لگانے کے لیے چٹ کھولی تو وہ چٹ کو دیکھتے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کا دماغ گھوم گیا۔ اُن کو اپنی آنکھوں کے سامنے تارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ اُٹے دال وغیرہ کے بعد بیگم نے لکھا تھا، بیٹی کے جہیز کا سامان۔ کچھ دیر سوچتے رہے بھشکر۔“ چیزوں کی قیمت لکھنے کے بعد جہیز کے سامنے لکھا ”یہ اللہ کا کام ہے اللہ جانے۔“

ایک دو مریض آئے ہوئے تھے۔ اُن کو حکیم صاحب دوائی دے رہے تھے۔ اسی دوران ایک بڑی سی کار اُن کے مطب کے سامنے آ کر رکی۔ حکیم صاحب نے کار یا صاحب کار کو کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ کئی کاروں والے ان کے پاس آتے رہتے تھے۔

دونوں مریض دوائی لے کر چلے گئے۔ وہ سوئڈنلینڈ صاحب کار سے باہر نکلے اور سلام کر کے بچ پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر آپ نے اپنے لیے دوائی لینے ہے تو اوھر سٹول پر آجائیں تاکہ میں آپ کی نبض دیکھ لوں اور اگر کسی مریض کی دوائی لے کر جاتی ہے تو بیماری کی کیفیت بیان کریں۔

وہ صاحب کہنے لگے حکیم صاحب میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ لیکن آپ مجھے پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیونکہ میں ۱۵، ۱۶ سال بعد آپ کے مطب میں داخل ہوا ہوں۔ آپ کو گزشتہ ملاقات کا احوال سنا ہوں پھر آپ کو ساری بات یاد آجائے گی۔ جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو وہ میں خود نہیں آیا تھا۔ خدا مجھے آپ کے پاس لے آیا تھا کیونکہ خدا کو مجھ

محمد علی صاحب یقین کریں، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ بیوی نے چٹ پر چیز لکھی ہو اور مولا نے اُس کا اسی دن بندوبست نہ کر دیا ہو۔ واہ مولا واہ۔ تو عظیم ہے تو کریم ہے۔ آپ کی بھانجی کی وفات کا صدمہ ہے لیکن اُس کی قدرت پر حیران ہوں کہ وہ کس طرح اپنے معجزے دکھاتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا جب سے ہوش سنبھالا ایک ہی سبق پڑھا کہ صبح ورد کرنا ہے ”رازق، رازق، تو ہی رازق“ اور شام کو ”شکر، شکر مولا تیرا شکر

§§§

شپ اہم ہیں۔ شہر کے قابل دید مقامات میں ایئر پورٹ، عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی، باغ جناح، شالامار باغ، مینار پاکستان، مال روڈ، انارکلی گلشن اقبال اور ریس کورس پارک شامل ہیں۔

مینار پاکستان کا ڈیزائن ترک ماہر تعمیرات نصر الدین مرآت خان نے تیار کیا۔ تعمیر کا کام میاں عبد القادر ایڈر کمپنی نے 23 مارچ 1960 میں شروع کیا۔ 21 اکتوبر 1968 میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس پر کل لاگت 75 لاکھ روپے آئے۔



بادشاہی مسجد لاہور میں شاہی قلعے کے نزدیک واقع ہے۔ اس مسجد کو مغل بادشاہ شا جہاں نے بنوایا تھا۔ اس میں دو لاکھ کے قریب نمازی نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے چاروں کونوں میں بہت اونچے مینار ہیں۔ مینار پر چڑھنے کے لیے باقاعدہ لکٹ لینا پڑتا ہے۔ اس مسجد کے درمیان میں بڑا حوض ہے۔

مسجد میں تین بڑے سنگ مرمر کے گنبد ہیں۔ ان پر مینا کاری اور گل کاری کی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر مغلیہ راج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے پچاس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ یہاں لوگوں کی بڑی تعداد جمعہ اور عیدین ادا کرتے ہیں جبکہ پانچوں نمازوں میں بھی بہت رش دیکھنے میں آتا ہے۔



لاہور ایک قدیم شہر

مصنف: حاجی بصیر سراج

تحریک پاکستان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے۔ جتنی خود مسلمانوں کی۔ اس لیے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا۔ دو قومی نظریے کی بنیاد ہندوستان میں اس دن پڑ گئی تھی۔ جس دن ساحل مالا بار کی ریاست گدنگا نور کے حکمران راجہ سامری نے اسلام قبول کیا تھا۔ رفتہ رفتہ دین اسلام کی شواہیں پھیلتی گئیں۔ محمد بن قاسم نے 712 میں سندھ فتح کر کے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اسلامی حکومت کے قیام سے انگریز حکومت تک مختلف مسلمان خاندانوں کی حکمرانی میں برصغیر میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کے باعث برطانوی حکومت نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ہندوؤں نے گٹھ جوڑ کرتے ہوئے اسلامی دشمنی کے سبب وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان کرانے کی بھرپور کوشش کی۔

1938 میں سندھ مسلم لیگ کی اکثریت کے ساتھ آزاد ملک کے حق میں باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی اور 23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ کے 27 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔



لاہور صوبہ پنجاب پاکستان کا دار الحکومت اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ پاکستان کا ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی مرکز ہے۔ اسے پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ شاہی قلعہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں مغل دور کی یادگار ہیں۔ لاہور کو پہلے عروس اہلند لاہور بھی کہتے تھے اور یہ علاقہ ملتان کی عظیم سلطنت کا حصہ ہوتا تھا۔

لاہور کی مغلیہ دور میں بھی اپنی ایک حیثیت رہی ہے۔ بابر پہلے سے ہی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دولت خان لودھی کی دعوت نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ لاہور کے قریب بابر اور ابراہیم لودھی کی افواج کا پہلا ٹکراؤ ہوا۔ جس میں بابر فتح یاب ہوا۔ لیکن جب اسے دولت خان کی سازش کی اطلاع ملی۔ جس پر وہ اپنا ارادہ ختم کر کے لاہور کی جانب بڑھا۔

اس شہر میں کئی بزرگوں اور صوفیائے کرام کے مزارات ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت میاں میر، مہدی اللہ حسین، حضرت شاہ ابوالعانی، حضرت موح دریا بخاری، حضرت گھوڑے شاہ، حضرت شاہ جمال، حضرت شاہ محمد غوث اور حضرت میاں وڈھا شامل ہیں۔ لاہور کا موجودہ شہر کئی جدید بستیاں اور عمارات سے آراستہ ہے۔ ان میں ماڈل ٹاؤن، گلبرگ، ڈیفنس، سبزہ زار گرین ٹاؤن اور ٹاؤن

ماحولیاتی آلودگی کا شکار بچے

مصنف: حاجی بصیر سراج



۵۷۰۰۰۰ پانچ لاکھ ستر ہزار بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں ہر سال سانس کی بیماریوں کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں جو کہ فضائی آلودگی اور سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

۳۶۱۰۰۰ تین لاکھ اسی ہزار بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں صاف پانی تک عدم رسائی، سینی ٹیشن کے نظام کی خرابی اور حفظان صحت کے اصولوں پہ عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہیضہ کا شکار ہوتے ہیں جس کی وجہ ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

۲۷۰۰۰ دو لاکھ ستر ہزار وہ بچے ہیں جو اپنی عمر کے لپٹرائی مہینہ میں حفظان صحت کے فقدان، گندے پانی اور فضائی آلودگی کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ مٹھتے ہیں۔

۲۰۰۰۰۰ دو لاکھ بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہے لیبریا کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں ان کی زندگی کو بچایا جا سکتا ہے اگر ماحول کی صفائی کی جائے اور پھجروں کا تدارک کیا جائے۔

۲۰۰۰۰۰ دو لاکھ بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں، وہ انہماک میں زخمی ہوتے ہیں مثلاً زہر خورانی، گرنا اور پانی میں ڈوبنا وغیرہ۔

اوپر دیئے گئے اعداد و شمار اگرچہ کہ پوری دنیا سے لئے گئے لیکن اس تناظر میں آج ہم اپنے حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں، کہ ہم ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے کس قدر احتیاط برت رہے ہیں، فضائی آلودگی کے حوالے سے عالمی رپورٹیں ہمارے ملک کے بڑے شہروں کے بارے جاری ہوتی رہتی ہیں کہ کس قدر آلودگی بڑھ رہی ہے، ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق کراچی کی فضا میں آلودگی کی تہہ کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، اس کے علاوہ کراچی ہی کی میڈیا رپورٹس موجود ہیں کہ اکثریتی آبادی آلودہ پانی پینے پہ مجبور ہے۔ یہ صورتحال پاکستان کے تمام بڑے اور چھوٹے شہروں کی ہے، بڑی بڑی آبپاشیاں گٹر وں سے آلودہ پانی پیتی ہیں، فضائی آلودگی کا حال یہ ہے کہ نہ ٹریفک کا نظام فعال ہے جو کہ دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں کا تدارک کرے اور نہ ہی فیکٹریوں اور ملوں کے دھوئیں اور دیگر ویسٹ کو مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانے کا کوئی عملی اور فعال نظام موجود ہے، اور مزید یہ کہ سب سے بری حالت سالڈ ویسٹ کے نظام کی ہے یا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ملک کے کسی بھی حصے میں قابل ستائش سالڈ ویسٹ سسٹم موجود نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ہسپتال سانس، معدے، کینسر، گردے، دل کی بیماریوں کے مریضوں سے اٹے پڑے ہیں۔ اور خاص طور پہ بچوں کی اموات ہو رہی ہیں۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ حکومتی سطح پہ ہنگامی فیبادوں پہ کام ہونا چاہئے، خاص طور پہ بلدیاتی نظام کو فعال اور منظم کرنے کی ضرورت ہے اور اس نظام سے کپٹ اور کالی بھیڑیوں کو نکالنے کی ضرورت ہے تاکہ بہتر لوگ آگے آئیں اور ایک منظم سینی ٹیشن، پینے کے صاف پانی، سالڈ ویسٹ میجمنٹ، ٹائون پلاننگ کے ذریعے ماحولیاتی آلودگی سے ملک کو پاک کرنے میں کردار ادا کریں اور اس کے علاوہ ہر فرد معاشرہ پہ انفراسٹرکچر پہ بھی یہ اولین ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بھی ماحول کو صاف کرنے میں اپنا کردار ادا کرے مثلاً سگریٹ نوشی، سے اجتناب گلی و محلے میں کھلی جگہوں پہ کوڑا کرکٹ بھینکنے کی عادت کو ختم کرنا، اپنے گلی اور گھر کی سیوریج کے نظام کو بہتر بنانا، کھلی نالیوں کو بند کرنا اور حفظان صحت کے اصولوں پہ نہ صرف خود عمل کرنا بلکہ خاص طور پہ بچوں کی تربیت کرنا۔ اس حوالے سے خاص طور سکولوں اور کالجوں کی سطح پہ تربیت کا نصاب ترتیب دینا نیز پبلک کی آگاہی کے لئے مہمات اور اس سلسلے میں حکومتی اداروں کے شانہ بشانہ اپنا حصہ ڈالیں۔ یقیناً اجتماعی کوششوں سے ہی اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔

§§§

عالمی ادارہ صحت کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں بچوں کا مستقبل ان کی صحت کے حوالے سے انتہائی خطرے سے دو چار ہے، اس کی وجہ ماحولیاتی آلودگی بتائی گئی ہے۔ اس آلودگی کی وجہ سے ایک اعشاریہ سات ملین بچے ہر سال دنیا بھر میں موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ بچوں کی ہر چار اموات میں سے ایک یا اس سے زیادہ غیر حتمندانہ ماحول کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہر سال ماحولیاتی خطرات جن کا تعلق اندرون یا بیرون سے ہوتا ہے جن میں فضائی آلودگی، دھوئیں کی وجہ سے آلودگی، مضر صحت پانی، غیر مناسب سیوریج کا نظام یا سیوریج کے نظام کی عدم دستیابی اور حفظان صحت کے نظام کی خرابی کی وجہ ہر سال سے ایک اعشاریہ سات ملین بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

عالمی ادارہ صحت کی دو مزید نئی رپورٹیں بھی منظر عام پہ آئیں جن میں ایک رپورٹ: Inheriting a Sustainable World کے مطابق ایک ماہ سے پانچ سال کے بچوں کی موت کی وجہ ہیضہ، تلیہ یا اور نمونہ ہیں، جن کا تدارک ماحولیاتی خطرات کو کم کر کے کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ صاف پانی کا حصول، پکانے کے لئے صاف ایندھن کی دستیابی، عالمی ادارہ صحت کی ڈائریکٹر جنرل Dr Margaret Chan کا کہنا ہے، آلودہ ماحول خاص طور پہ بچوں کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ ان کے بڑھتے ہوئے اعضاء، کمزور مدافعتی نظام اور ان کی چھوٹے جسم اور ہوا کے راستے انہیں گندے پانی آلودہ ہوا سے غیر محفوظ بناتے ہیں، ان خطرات کا آغاز ماں کے پیٹ سے شروع ہوتا ہے اور قبل از وقت پیدائش کے خطرات کو بڑھاتا ہے۔ مزید یہ کہ جب اندرون خانہ یا بیرون جب شیر خوار اور سکول جانے سے پہلے کی عمر کے بچے ہوائی آلودگی اور سگریٹ کے دھوئیں سے متاثر ہوتے ہیں تو ان میں نمونیہ کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہوائی آلودگی میں رہنے کی وجہ سے دل کی بیماریوں، کینسر کا بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پانچ بڑی وجوہات جن کا تعلق بچوں کی اموات سے ہے ان کا تعلق ماحولیات سے ہے۔

ایک اور رپورٹ: A companion report, Don't pollute my future! The impact of the environment on children's health نے جامع جائزہ پیش کیا ہے جس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

نہی پری

مصنف: حاجی بصیر سراج



میں حسبِ معمول اپنے گھر کے قریب وسیع و عریض پارک میں شام سے پہلے واک کرنے آیا ہوا تھا سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں ٹھنڈی ہواؤں میں خشکی کا احساس بڑھ رہا تھا موسم کی خوشگواریت کی وجہ سے بہت سارے لوگ پارک میں آئے ہوئے تھے بچے، نوجوان، بڑے اور بوڑھے ہر عمر کے لوگ سبزہ پھول درخت جمیل ہر طرف خدا کی قدرت اپنی رعنائی کا اور دلکشی کا مسکور کن احساس دلا رہی تھی کیونکہ گرمی کے بعد اب ٹھنڈ شروع ہو چکی تھی اس لیے واک کرنے والے اور پارک کی سیر کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی میں جو بچپن سے سبزے ہریالی درخت پھول جمیل فطرت کا شوقین ہوں سب کچھ انجوائے کرتا ہوا تیزی سے مٹی کے واکنگ ٹریک پر ادھر ادھر دیکھتا بڑے بڑے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا حسبِ معمول میرے ہونٹوں پر اسماء الحسنی کا ورد جاری تھا پارک سبزہ فطرت کے خوبصورت مناظر اور اللہ کا ذکر سبحان اللہ میرا جسم اور روح کیف انگیز کیفیت کو انجوائے کر رہے تھے خوشگوار موسم کے اثرات سے میرا جسم روح شہرشی کی حالت میں تھے دورانِ واک چند ایسے دوستوں کا سامنا بھی ہوا جو اکثر یہاں واک کرتے ہیں ان سے مسکراہٹ کا تبادلہ کر کے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ پارک میں لاہو ر کے لوگوں کے علاوہ بہت بڑی تعداد مسافروں یا باہر سے آنے والے لوگوں کی ہوتی ہے مختلف علاقوں سے آنے والے لوگوں کا اپنا اپنا کچھر زبانی رنگ و جسامت یہ سب مل کر ایک مخلوط کچھر سا بنلاپتے ہیں میں ان کو بغور دیکھتا جا رہا تھا اکلاکائے شادی شدہ جوڑے بھی نظر آ رہے تھے جو دنیا مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دھن میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھے یا چلتے نظر آ رہے تھے یہ نئے شادی شدہ جوڑے اپنی ہی دھن میں شادی کے غبار میں مست چہروں پر رنگوں کی قوس قزح بکھیرے نظر آ رہے تھے میں چونکہ بچپن سے متجسس مزاج رکھتا ہوں اور اس لیے بغور لوگوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا پارک میں اکثر نوجوانوں کے مختلف ٹولے بھی نظر آتے ہیں جو نوجوان لڑکیوں کو چھیڑنے یا آوازیں کسنے سے باز نہیں آتے وہ بھی نظر آ رہے تھے ہر شریف انسان کی طرح مجھے بھی ان پر بہت غصہ آتا تھا لیکن ساتھ یہ بھی سوچ کہ یہ عمری ایسی ہے جس میں خوف ہوش کی بجائے صرف جوش اور جوش ہی ہوتا ہے اس لیے ایسے لڑکوں کو نظر انداز کر دیتا میں واک کرتا ہوا پارک کے ایسے حصے میں آگیا جہاں مجھے ایسا ہی ادبش نوجوانوں کا ٹولا نظر آیا جو شاید کسی لڑکی کو تنگ یا اس پر آوازیں کس رہے تھے میں روزانہ کی طرح نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا لیکن جب واک کرتا ہوا پورا چکر لگا کر دوبارہ اسی جگہ پر آیا تو دیکھا کہ وہ لڑکے اسی طرح ہی لڑکی کو تنگ

اور آوازیں کس رہے تھے اب میں نے بغور اس لڑکی کی طرف دیکھا تو سامنے ایک پندرہ سولہ سال کی سکول کے یونیفارم میں ملبوس کسی چھوٹے شہر کی دھان پان سی سلاہ لڑکی نظر آئی جھکائے بیٹھی تھی اس کی گود میں اس کا کتا بوں کا بیگ بھی تھا پہلے تو میں ہلکا مزاق سمجھ کر گزر گیا اب مجھے معاملہ سنجیدہ نظر آنے لگا میں تھوڑی دور جا کر رک گیا اور حالات کا سنجیدگی اور نزاکت کا احساس کرنے لگا۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا تین یا چار لڑکے تھے جو باری باری اس کو تنگ کر رہے تھے وہ لڑکی سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے پاس اس کی کوئی ساتھی یا بزرگ نہیں تھا میں نے چند منٹوں میں ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ اکیلی لڑکی ہے اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں سورج غروب ہونے کو تھا رات کا آٹھ بج رہی تھی وہ روشنی کو نگل رہا تھا نیم اندھیرے کی وجہ سے لڑکوں کی بدتمیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا بلکہ وہ شاید اندھیرے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ زیادہ بدتمیزی کر سکیں میں سمجھوتہ کو بھانپ چکا تھا کہ کوئی اس لڑکی کو یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور یہ بھاری اس کا یا تو انتظار کر رہی ہے یا پھر اس کو سمجھ نہیں آ رہی کہ اب اس پر دیکھی شہر میں وہ کیا کرے وہ مجبوری بے بسی کا بت بنی بیٹھی تھی اب میں جان چکا تھا کہ لڑکی شدید خطرے میں ہے اور کسی خوفناک حادثے کا شکار ہو سکتی ہے میں نے فوری طور پر اپنے واقف سیکورٹی گارڈ کو بلا دیا اور اس لڑکی کی طرف بڑھا مجھے اور سیکورٹی گارڈ کو آتے دیکھ کر ادبش بڑے تیزی سے بھاگ گئے میں آہستہ آہستہ بیٹی کے پاس ہو گیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر بری طرح ڈر گئی خوف اور پرہیز کی وجہ سے اس کا جسم لرز رہا تھا اس کے چہرے پر خوف کی زردی پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں خوف دہشت و یرانی اور قبرستان کے سانے کا راج تھا میں شفیق لہجے میں بولا بیٹی مجھ سے ڈرو نہ میں آپ کے باپ جیسا ہوں تم میری بیٹی ہو اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے آپ میری بیٹی ہو اب تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے لہجے کی شفقت اور مٹھاس سے اس کی آنکھوں میں زندگی کی رمت لہرائی اور اس نے میری طرف دیکھا میرے شفقت سے لبریز لہجے سے اس کے اندر جیسے کوئی آنسوؤں کا جہرنا پھوٹ پڑا جیسے خود بخود کوئی والو کھل گیا ہو اور پانی بہنا شروع ہو گیا اس کی معصوم آنکھوں میں عجیب سا سیلاب تھا جو اب بند توڑ کر بہہ نکلا تھا نہ اس کے چہرے کا زاویہ بدلا نہ ہی کوئی آہ بکا نہ سسکی نہ چیخ نہ آواز پانی اس کی آنکھوں سے اس کے رخساروں کو مسلسل تر کرنے لگا اس کے اندر کا کرب اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا خوف اور دہشت سے وہ شاید قوت گو پائی سے محروم ہو چکی تھی آنسوؤں کی کثرت نے اس کی قوت گو پائی جھین لی تھی یہ وہ کلت کا شکار ہو چکی تھی مجھے اس پر بہت پیا آ رہا تھا میں اس کی بے بسی اور آنسوؤں کی برسات سے اندر ہی اندر کٹ رہا تھا وہ نہی معصوم پری اپنے آنسوؤں سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان سنا رہی تھی۔ میرے شفقت بھرے رویے کی وجہ سے اس نے کئی بار بولنے کی کوشش کی لیکن زبان شاید اس کے اختیار میں نہیں تھی یا خوف نے اس کے جسم و جان کو اس بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ الفاظ زبان پر آنے سے پہلے ہی تہلیل ہو جاتے تھے اس کے اعصاب اور عضلات کسی بہت بڑی منفی کیا کی تبدیلی سے گزرے تھے کہ ان کا اس میں تال میل ختم ہو حرکت بیٹھی تھی مجھے لگ رہا تھا وہ شاید نیم فالجی کیفیت کا شکار ہو چکی ہی وہ اپنے آپ میں نہیں تھی اس کا جسم اور دماغ کسی شدید حادثے سے گزرنے کے بعد کام کرنا چھوڑ چکے تھے اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ جا رہی تھی میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھ دیا محفوظ ہو تم بالکل نہ ڈرو وہ خاموش گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی درد دکھ نمی بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا وہ رونے کی کوشش نہیں کر رہی تھی آنسو اس کے ضبط کے سارے بندھن توڑ کر خود بخود بہنے جا رہے تھے اس کے اندر پتہ نہیں کتنے سسندوں کا پانی تھا جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اس کا معصوم نازک چہرہ لگا تھا آنسوؤں سے جھجک چکا تھا میں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بولے الفاظ نکلے وہ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

